حکمتِ اقبال
(۶۱)
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور علومِ مروّجہ

خودی اور ایڈلرزم

فرائڈ کے ایک شاگرد ایڈلر (ADLER) نے اپنے استاد کی خیال آرائیوں سے اختلاف کر کے انہیں غلط قرار دیا ہے لیکن اس کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اگر جبلتِ جنس نہیں تو جبلتِ تفوق (Self Assertion) ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر بنائے اور دوسروں سے زیادہ قوت اور طاقت حاصل کر کے اُن پر غالب آئے۔ انسانی فرد جب دنیا میں آتا ہے تو کمزور ہونے کی وجہ سے اپنی ہر ضرورت اور خواہش کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے اس کمتری کے مقام سے راضی نہیں ہوتا بلکہ تمنا کرتا ہے کہ جدّوجہد کر کے اپنی کمتری کو دور کرے اور لوگوں کی توجہ اور ستائش کا مرجع بن جائے اور یہی تمنا اس کی زندگی کی ساری تگ و دو کا سبب بنتی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ پھر انسان کی فطرت میں نصب العین کی محبت کا مقام کیا ہے اور کیوں جبلتِ تفوق کی بجائے نصب العین ہی انسان کے سارے اعمال کا حکمران نظر آتا ہے تو ایڈلر اس سوال کا جواب فرائڈ ہی کی طرح یہ دیتا ہے کہ نصب العین کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ انسان کی آرزوئے تفوق کی ایک ذہنی توجیہ ہوتا ہے۔ انسان کا نصب العین وہی تصور ہوتا ہے جو اس کے خیال میں اس کی کمتری کی تلافی کر سکتا ہے اور اسے قوی اور طاقت ور بنا سکتا ہے۔ چونکہ افراد کی اپنی کمتری کے تصورات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کے وہ تصورات بھی مختلف ہوتے ہیں جو ان کے خیال میں ان کی کمتری کو دور کر سکتے ہیں۔ یہی تصورات اُن کے نصب العین ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگ حُسن، نیکی اور صداقت کے اوصاف کو پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اُن اوصاف کو اپنا لیتا ہے وہ لوگوں میں پسندیدہ ہو جاتا ہے اور لہٰذا قوت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ ایڈلر کا نظریہ کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اگر بچہ شروع ہی سے بڑوں میں رہنے کی وجہ سے اپنی کمتری اور دوسروں کی بڑائی کے احساس کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے اس مقام کو ضروری اور قدرتی سمجھ کر اس سے رضامند کیوں نہیں ہو جاتا اور کیوں اس کے خلاف ردِ عمل کر کے اپنی کمتری کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ بڑائی یا عظمت کی محبت اس کے دل میں شروع سے ہی اس کی فطرت کے ایک ضروری عنصر کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت فلسفۂ خودی کی تائید مزید نہیں کرتی جس کی رُو سے انسان، خدا اور اُس کی صفات حسن، نیکی، صداقت، قوت اور عظمت کی محبت کا ایک جذبہ ہے۔ اگر انسان میں خدا کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو اس میں عظمت کی محبت بھی نہ ہوتی اور وہ قوت اور عظمت کے حصول کی تمنا بھی نہ کر سکتا۔

بچہ ستائش کا طالب اس لیے ہوتا ہے کہ ستائش حسن کے لیے ہوتی ہے اور وہ بحیثیت انسان کے برتن آرزوئے حسن ہے۔ ستائش کے طالب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے معلوم ہے کہ بعض اوصاف ستائش کے قابل ہوتے ہیں اور بعض ستائش کے قابل نہیں ہوتے۔ اُس کی خودی میں ایک معیار رکھ دیا گیا ہے جس سے وہ حُسن کو غیر حُسن سے تمیز کرتا ہے۔ اس معیار پر صرف خدا کا تصور ہی پورا اتر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معیار خدا کی محبت کا جذبہ نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ خدا کی محبت ہے نہ کہ جبلتِ تفوق!

۲۔ قدرت نے جبلتِ تفوق کا دائرہ کار بہت محدود رکھا ہے۔ یہ جبلت قدرت نے حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں حیوان کو اس لیے دی تھی کہ وہ اس کی مدد سے مخالف حملہ آور حیوانات کا مقابلہ کر کے اُن پر غالب آئے تاکہ اپنی زندگی اور نسل کو برقرار رکھ سکے۔ انسان میں آ کر بھی اس جبلت کا مقصد اور جبلتوں کی طرح وہی رہتا ہے جو حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں تھا یعنی بحیثیت حیوان کے انسان کی بدنی اور حیاتیاتی زندگی کی حفاظت لیکن جس طرح فرائڈ نے جبلتِ جنس کو مضحکہ خیز حد تک وسعت دے کر انسان کے سیاہ و سفید کا مالک فرض کر لیا تھا اُسی طرح ایڈلر نے جبلتِ تفوق کو غیر معمولی حد تک وسعت دے کر انسان کا آمرِ مطلق فرض کر لیا ہے تاکہ فطرتِ انسانی میں نصب العین کے مقام کو نظر انداز کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی مرحلۂ ارتقاء میں ایسا کیوں ہوا ہے اور اُس کے ہونے کا ثبوت کیا ہے کہ جبلتِ تفوق اپنے اصلی حیاتیاتی دائرہ کار سے عبور کر کے

انسان کی تمام جبلتوں پر حکمران ہو گئی ہے۔

جب ایڈلر کا کوئی معتقد ان سوالات کا ایسا معقول اور مدلل جواب دینے کی کوشش کرے گا جو انسان اور کائنات کے تمام علوم اور مسلمہ حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو تو اس کی توجہ لازماً ایسے حقائق کی طرف ہو گی جن کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ جبلت تفوق نہیں بلکہ خدا اور اس کی صفات (حسن، نیکی، صداقت، قوت، عظمت وغیرہ) کی محبت ہے اور یہی نتیجہ فلسفہ خودی کا نچوڑ ہے۔

خودی اور میکڈوگل ازم

میکڈوگل (Mc Dougall) کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی جبلتیں ہیں وہ لکھتا ہے:

"جبلتیں انسان کے سارے اعمال کو حرکت میں لانے والی بنیادی قوتیں ہیں"

میکڈوگل تسلیم کرتا ہے کہ انسان اور حیوان کی جبلتیں ایک ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ حیوان اور انسان کے فطرتی رجحانات اور قدرتی اعمال و افعال بھی ایک ہی ہوں لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسانی فطرت کے بعض امتیازات ایسے بھی ہیں جو حیوان میں موجود نہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کسی علمی، اخلاقی، روحانی یا جمالیاتی نصب العین کی خاطر اپنی جبلتوں کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن حیوان جبلتوں کی مخالفت نہیں کر سکتا کیونکہ نصب العین کی محبت کا جوہر حیوان میں موجود نہیں لیکن یہ نصب العین کی محبت انسان میں کہاں سے آئی ہے؟ فطرت انسانی میں اس کا ماخذ، مقام اور درجہ کیا ہے؟ کیا یہ بھی کوئی جبلت ہے؟ میکڈوگل کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک جبلت نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو جبلتوں کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبہ کو وہ جذبۂ ذات اندیشی کا نام دیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یہ جذبہ جبلت تفوق کی مدد سے دوسری جبلتی خواہشات کی مخالفت کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

میکڈوگل کا یہ نظریہ بہت سے اعتراضات کی زد میں آتا ہے مثلاً:

۱۔ اگر انسان کے اندر اس کی حیوانی جبلتیں مل کر اور ترکیب پا کر نصب العینی خواہش پیدا کر سکتی ہیں تو حیوان میں کیوں پیدا نہیں کرتیں؟ بالخصوص جب میکڈوگل تسلیم کرتا ہے کہ انسان اور حیوان میں جو چیز امتیاز پیدا کرتی ہے وہ فقط عقل ہے جو انسان میں ہے اور حیوان میں نہیں اور انسانی عقل انسانی

جبلتوں کی اُس ترکیب کا سبب نہیں جو جذبۂ ذات اندیشی کی صورت اختیار کرتی ہے۔

۲۔ اگر نصب العینی خواہش جبلتوں کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہے تو وہ جبلتوں کی مخالفت کیوں کرتی ہے؟ یہاں تک کہ اُس کی خاطر ایک انسان بعض وقت نہ صرف اپنی جبلتی ضروریات کو بلکہ اپنی زندگی کو بھی (جس کی حفاظت کے لیے وہ موجود ہوئی ہیں) قربان کر دیتا ہے۔ اور پھر نصب العینی خواہش جبلتی خواہشات کو، میکڈوگل کے اپنے الفاظ میں "خوف" (Horror) اور "حقارت" (Detestation) کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہے؟

۳۔ بعض وقت جبلتِ تفوق کا مقصد نصب العینی خواہش کے مقصد کے بالکل برعکس قسم کا ہوتا ہے۔ جبلتِ تفوق تو فقط غلبہ کا تقاضا کرتی ہے لیکن بعض وقت ایک انسان اپنے نصب العین کی ناداری، کمزوری، بیچارگی اور ذلت بلکہ موت تک کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں جبلتِ تفوق جو غلبہ چاہتی ہے جذبۂ ذات اندیشی یا نصب العینی خواہش کی مدد کیونکر کرتی ہے؟

اگر نصب العینی خواہش کی تشریح کے لیے فلسفۂ خودی کی اس روشنی کو قبول کر لیا جائے کہ نصب العین کی محبت انسانی فطرت کا ایک مستقل جذبہ ہے جو جبلتوں کے کسی مرکب سے پیدا نہیں ہوا تو اس تشریح پر اس قسم کے کوئی اعتراضات وارد نہیں ہو سکتے۔

خودی اور مارکسزم

کارل مارکس (Karl Marx) کے نزدیک بنیادی طور پر انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ جبلتِ تغذیہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ حیوان خوراک حاصل کر کے اپنی زندگی کو برقرار رکھے۔ چونکہ خوراک کا مقصد زندگی کا قیام ہے، کارل مارکس خوراک کی ضرورت میں انسان کی اور ایسی ضرورتیں بھی شامل کرتا ہے جن کی تشفی بقائے حیات کے لیے ضروری ہے، مثلاً موسم کے مطابق کپڑا اور گرمی اور سردی سے بچاؤ کے لیے رہائشی مکان وغیرہ، اور ان سب کو ملا کر وہ اقتصادی ضروریات کا نام دیتا ہے۔ کارل مارکس تسلیم کرتا ہے کہ انسان اخلاقی، مذہبی، روحانی، علمی، جمالیاتی اور سیاسی نصب العینوں سے محبت کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ انسان کے اعمال بظاہر نصب العینوں کی خاطر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ نصب العینوں کے لیے شعور (Consciousness) یا مشتملاتِ شعور (Contents of

Consciousness) کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اس کی اقتصادی ضروریات ہیں تو انسان کے نصب العینوں کی حیثیت کیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال اقتصادی ضروریات سے نہیں بلکہ نصب العینوں سے پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کارل مارکس اور اس کا دوست اور فلسفۂ سوشلزم کی تخلیق کا شریک کار اینجلز دونوں اس حقیقت کی ایک عجیب و غریب وجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ در اصل تو اقتصادی ضروریات ہی انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہیں لیکن انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی اقتصادی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ کسی نصب العین کے لیے جدّوجہد کر رہا ہے۔ یہ بات کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر چلا جا رہا ہو اور دیکھنے والوں کو ساتھ ساتھ یہ کہتا جائے کہ آپ یقین کیجیے میں درحقیقت پیدل چل رہا ہوں۔ آپ کو فقط ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جو کچھ محسوس ہوتا ہے حقیقت وہ نہیں تو اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے کہ حقیقت کچھ اور ہے، ورنہ جو کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کو حقیقت کیوں نہ سمجھا جائے؟ ذاتی احساس سے بڑھ کر کسی چیز کا ثبوت اور کیا ہو گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب دنیا میں ہر آدمی کا احساس وہی ہو اور اس کلیہ کا استثناء ایک بھی موجود نہ ہو۔ ہر مشاہدہ بھی تو دیکھنے والے کے ذاتی احساس میں بدل کر ہی ایک حقیقت بنتا ہے۔ در اصل یہ حکما اس قسم کا بے بنیاد دعویٰ کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کا ہر مذہبی، علمی یا اخلاقی انقلاب درحقیقت ایک اقتصادی انقلاب تھا۔

مارکس لکھتا ہے:

> "جس طرح سے کوئی شخص ایک فرد کے متعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اُس طرح سے کوئی شخص سماجی انقلاب کے ایک دَور کے متعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ اس دَور کے لوگوں کا شعور (یعنی نصب العین) کیا ہے۔"

اسی طرح سے اینجلز لکھتا ہے:

> "نصب العین کی سوچ ایک ایسا عمل ہے جسے نام نہاد سوچنے والا لاریب شعوری طور پر انجام دیتا ہے، لیکن ایک کاذب شعور کے ساتھ۔ اُس کے عمل کو حرکت میں

لانے والی اصل قوتیں اس کے لیے نامعلوم رہتی ہیں۔ لہٰذا وہ عمل کی کاذبہ اور ظاہری قوتوں کا ہی تصور کرتا ہے۔ چونکہ اُس کا سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصب العین پر مبنی ہے۔"

لیکن اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ جو شخص ایک اخلاقی یا مذہبی نصب العین کی جستجو کرتا ہے، اس کا یہ خیال کاذب ہوتا ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے اور درحقیقت وہ اپنی اقتصادی ضروریات کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک شخص کو دماغی طور پر صحت مند ہونے کے باوجود اپنی اقتصادی ضروریات کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کے ایسے تقاضے نظر آتے ہیں جن کا اقتصادی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ جن کی خاطر وہ اپنی اقتصادی ضروریات کو بلکہ اپنی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب ایک شخص کو بھوک لگتی ہے تو وہ صاف کہتا ہے کہ اُسے خوراک کی ضرورت ہے اور یہ نہیں کہتا کہ اُسے مسجد میں جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب وہ اپنی بھوک کا علاج کرنے کے لیے موجودہ اقتصادی حالات کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ صاف طور پر اپنے مقصود کا ذکر کیوں نہیں کرتا، اور اس کی بجائے کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کا ذکر کیوں کرتا ہے اور اس کی عقل پر ایسا پردہ کیوں پڑ جاتا ہے جو اُس کو بھلا دیتا ہے کہ وہ درحقیقت کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ اقتصادی تبدیلی کو برپا کرنے کے لیے ایک ٹیڑھا اور منافقانہ راستہ اختیار کر کے یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ فلاں مذہبی یا اخلاقی نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ مارکس اور اینجلز کے خیال کے مطابق انسان فقط ایک اقتصادی وجود ہے اور ایک مذہبی یا اخلاقی وجود نہیں۔ اور اُس کے لیے سیدھا اور غیر منافقانہ راستہ اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔ جب انسان کی ساری خواہشات اقتصادی خواہشات ہیں تو وہ ظاہری طور پر لاشعوری طور پر یا منافقانہ طور پر بھی ایسی غیر حقیقی اور فرضی خواہشات کا بندہ کیوں بن جاتا ہے جو رُوحانی یا اخلاقی خواہشات کہلاتی ہیں اور جن کے مقابلہ میں وہ اقتصادی خواہشات کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور پھر جب کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ اُس کے عمل کے اصلی محرکات کیا ہیں تو مارکس اور اینجلز کو ان محرکات کا علم کیسے ہو گیا؟ اینجلز تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا "سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے" لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ یہ نہیں مانتا کہ یہ عمل نصب العین پر مبنی ہے حالانکہ کسی دلیل کے بغیر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ نصب العین کے ذریعہ سے اسی لیے انجام پاتا ہے کہ وہ درحقیقت اس پر مبنی ہے۔

ایک قابلِ غور بات

یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے مشتملاتِ شعور یا ہمارے نصب العین (خواہ مارکسی انہیں اقتصادی حالات کی پیداوار یا اقتصادی ضروریات کی کاذب اور بگڑی ہوئی شکلیں ہی کیوں نہ سمجھیں) ہمیشہ حُسن نیکی اور صداقت کے اوصاف کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ ہر حالت میں ان ہی صفات سے حصہ لیتے ہیں اور جُوں جُوں اپنے آپ کے متعلق ہمارا علم ترقی کرتا جا رہا ہے وہ ان صفات سے اور قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اقتصادی ناہمواریوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہوں تو پھر بھی ہم انصاف، انسدادِ ظلم، عدل، مساوات، اخوت، آزادی اور جمہوریت ایسے تصورات کا نام لیتے ہیں جو حُسن نیکی اور صداقت اور خدا کی دوسری صفات سے ماخوذ ہیں اور حُسن کی تمنا خدا کی آرزو کا ایک عنصر ہے۔ ان اوصاف کی تمنّا ہمارے تمام انقلابات کا مشترک پس منظر ہوتی ہے' خواہ یہ انقلابات اقتصادی ہوں یا اخلاقی یا مذہبی یا علمی یا سیاسی۔ کیا یہ حقیقت اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ حُسن' نیکی اور صداقت کی آرزو انسان کے شعور کی ایک مستقل خاصیت ہے جس کی تشفی کے لیے ہم وقتاً فوقتاً اپنے اقتصادی، اخلاقی، علمی اور سیاسی حالات کو بدلنے کے لیے جدّوجہد کرتے رہتے ہیں۔

مشتملاتِ شعور میں کارل مارکس نے عقل اور استدلال کو بھی شمار کیا ہے۔ چونکہ عقل بھی اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے وہ صداقت کی جستجو کرنے کے لیے آزاد نہیں اور لہٰذا صداقت کو دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ نقطہ نظر سراسر غیر عقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی یہ سمجھے کہ وہ گردوپیش کے اقتصادی حالات سے آزاد ہو کر عقلی استدلال کر رہا ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک وہم میں مبتلا ہے، لیکن اگر صداقت دریافت نہیں کی جا سکتی تو مارکس کے پیرو اپنے فلسفہ کو ایک صداقت کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں۔

مارکس اور اینجلز نے اپنے فلسفہ کی بنیاد عقلی استدلال پر رکھی ہے اور وہ عقلی استدلال ہی سے دوسروں کو قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر انسان کی عقل بھی وہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہے جو مروّجہ اقتصادی حالات مقرر کریں تو پھر اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس قابل ہی ہو سکتی ہے کہ صداقت کی طرف راہنمائی کرے۔ اگر اشتراکیت کا فلسفہ بھی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے تو پھر نہ وہ عقل پر مبنی ہو سکتا ہے اور نہ درست۔

(جاری ہے)